مولانا ابوالکلام آزاد
بحیثیت ایک صاحبِ طرز انشاپرداز کے

از جناب رفیع انور صاحب ایم اے

(۲)

مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں

"خود صحبت آزمایانِ شبینہ کا بیان ہے کہ یہ بادہ گساری رات کے دو بجے تک جاری رہی تھی۔ اللہ! اللہ!! جاڑے کی راتیں اور پچھلے پہر کی "پراسرار" صحبتیں!!! آپ الزام و اعتراض کی فکر میں ہیں اور رات کے دو بجے کے لفظ سے نہیں معلوم کیسے کیسے خیالات میرے دل میں گزر رہے ہیں۔" . . . . "رات کی تاریکی، پچھلا پہر، رندان شاعر کہنہ کا ہجوم اور بعض نوجوان دنو آموز مدعیانِ حریت اور پھر شغلِ مے پرستی کا یہ عالم! اب کیا کہوں کہ کیا کہنا چاہتا ہوں۔"

(از حدیث الغاشیہ)

پھر:-

چند دل کے ٹکڑے ہیں جن کو صفحوں پر بچھانا چاہتا ہوں۔ کیونکر بچھاؤں؟ چند آنسو ہیں جن کو کاغذ پر پھیلانا چاہتا ہوں کیونکر پھیلاؤں؟ آہ! ان لفظوں کو کہاں سے لاؤں جو دلوں میں ناسور پیدا کر دیں۔ آہ! اپنے دل کے زخموں کو کیونکر دکھاؤں کہ اوروں کے دل بھی زخمی ہو جائیں۔" . . . "موت دونوں کو آتی ہے۔ سپاہی کو میدانِ جنگ میں اور مجرم کو سولی کے تختے پر۔ پہلی وہ عزت کی موت ہے جس پر ذلت کی ہزاروں زندگیاں قربان اور دوسری وہ

ذلت کی موت ہے جس کے بعد انسانی روح کے لئے اور کوئی ذلت نہیں اگر یورپ نے ہم سے آخری انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا ہے تو کاش ہمارے سینے میں گولی لگتی۔ ہمارے گلے میں پھندا نہ ڈالا جاتا۔"

کس قدر سلیس اور سہل الفاظ ہیں مگر کس قدر معنی خیز اور موثر، لفظوں اور فقروں میں دل کے ٹکڑے اور سینے کے داغ چھپے ہوئے ہیں، ان کی تحریر ایک سلگتی ہوئی آگ، بھڑکتا ہوا شعلہ، امنڈتا ہوا سیلاب اور کڑکتی ہوئی بجلی ہے کہیں کہیں آہیں اور نالے بھی ہیں۔ بلکہ یقین اور ایمان کی پختگی قدم قدم پر نظر آرہی ہے۔ مثلاً:۔

"صداقت کی مظلومی کوئی نیا واقعہ نہیں۔ اس پر ابتلا و آزمائش کے ایسے ایسے ہلاکت آفریں وقت آئے ہیں۔ جب خدا کی زمین پر چند دلوں کے سوا اس کا کہیں نشیمن نہ تھا لیکن باوجود اس کے سچ سچ رہا اور باطل باطل۔ حق کی قوت کا استحکام متزلزل نہیں ہو سکتا۔" وغیرہ وغیرہ۔

وہ اس چیز کے خلاف ہیں کہ غم واندوہ اور ناکامیاں ہماری جدوجہد کو بند کر دیں۔ وہ غم انگیز موضوعات پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن عبرت و بصیرت کے حصول اور آئندہ کو روشن بنانے کے لئے انھوں نے ترکی شہیدوں کی لاشوں پر خونتابہ فشانی کی ہے۔ کانپور کے خونی ہنگامہ پر بزم عزا کو ترتیب دیا ہے۔ شہدائے طرابلس کی یاد میں خون کے آنسو بہائے ہیں۔ خود اپنے جسم و جان کو قید و بند کی صعوبتوں اور رنج و الم کی مصیبتوں میں گرفتار کرایا ہے۔ لیکن بایں ہمہ یاس کا سایہ کبھی ان کی تحریر پر نہیں پڑتا۔ ان کے نزدیک زندگی عیش و نشاط کا نہیں بلکہ ڈوب ڈوب کر ابھرنے اور قدم قدم پر ٹھوکریں لگنے، چلنے اور گر پڑنے لیکن پھر سنبھلنے اور سب کو سنبھال لینے کا نام ہے۔ وہ ہر خونچکاں کفن اور ہر مجروح سینہ کی زبانی نصرت و کامرانی اور فوز و فلاح کا پیغام سناتے ہیں۔ رنج و الم اور خونی ماحول کے مقدمے بہترین طریقے پر ترتیب دے کر فتح و مراد کا نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ تاکہ قوم میں حرکت و عمل پیدا ہو۔ وہ رُلاتے ہی نہیں بلکہ بے پناہ

طریقے سے تڑپاتے ہیں تاکہ ہنسایا جا سکے۔

مقصودِ ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

اسی چیز سے متاثر ہو کر میں الاحرار مولانا محمد علی مرحوم نے فرمایا تھا کہ میں نے لیڈری ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری سے سیکھی۔

مولانا آزاد کی بعض تحریروں میں طنز بھی پائی جاتی ہے اور ان کا نشانہ طنز "جدیدیت" علم و دانش کا زعمِ باطل اور افرنگیت ہوتے ہیں۔ ان کی طنز کا انداز نمایاں طور پر سرپرستانہ اور بے پروایانہ ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ دنیا بھر کو پائے استحقار سے ٹھکرا رہے ہوں اور ہر شے ہیچ پوچ ہو کر رہ گئی ہو۔ ان کی طنز میں ایک جبروتی شان ہوتی ہے۔ ان کے یہاں خطیبانہ جوش اور ہیجان طغیانی ہے اور انھوں نے اپنی طنزیات میں خطابت کو بہترین طریقہ سے سمویا ہے۔ ان کی طنز کے ایک ایک فقرہ اور خیال میں قوت اور بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں۔ وہ بددعاؤں اور عذابِ الیم کی بشارتوں سے نہیں ڈرتے بلکہ ان کا یہاں ایک اعتبار و تسلیم و مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہاں شدتِ استہزار تو ہو سکتی ہے لیکن زیرنا کی کا گزر نہیں۔ ملاحظہ ہو "بیشک مدتوں کے بعد بند ٹوٹے، جس کو کفر کہا تھا اس کے ثواب و طاعت ہونے کا فتویٰ دینا پڑا لیکن کیونکر اپنی قوت سے، اپنے دماغ سے، اپنی ہستی اور اپنی روح سے، یہ نہیں بلکہ ع

آں ہم بسعی غمزہ مردم شکار دوست

پہلے جن کے حکم سے گمنامی کے غاروں میں چھپے تھے انہی کے حکم سے باہر نکلے تاکہ مندر میں جا کر ان کے آگے سربسجود ہوں۔ بے شک شملہ ڈیپوٹیشن کے تماشے کے بعد ان کا آخری پارٹ کھیلا گیا اور اس کا نام لیگ رکھا گیا۔ لیکن اگر تم ایک برف خانہ بنا کر اس کا نام آتشکدہ رکھ دو گے تو کیا برف کی سل آگ کا انگارہ ہو جائے گی۔ اگر ایک کھلونے کا پتلا لیکر اس کے سینے کے پاس کی کل کو انگوٹھے سے دباؤ گے تاکہ اپنے ہاتھ ہلا کر تالی بجائے تو کیا اس تماشے سے وہ انسان کا بچہ سمجھ لیا جائے گا۔

ہندو مسلم سوال بھی ایک بازیگر کا کھیل ہے اور بدبختی سے ناچنے والے ناچ رہے ہیں، فوج میں پھوٹ پڑگئی ہے اور غنیم مطمئن ہے۔ یہ خیال کہ تم نے ابھی تعلیم میں ترقی نہیں کی اس لئے تمہارا پالیٹکس بھی ہے کہ پہلے ہندوؤں سے اپنے غصب کردہ حقوق چھین لو۔ غور کرو کہ حریفِ شاطر کی چال کس قیامت کی ہے ؎

وہ رہزن اور پھر ایسے مکین سے

کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ جس جماعت نے مخالفت میں حصہ لیا، ان میں وہ کون لوگ ہیں جن کو سیاست فہمی اور قوم پرستی کا یہ خلعت عطا ہو رہا ہے؟ . . . کیا وہ مسکین جو اپنے پیشواؤں کے شور و غل پر اسی آموختہ کو دہرا دیتے تھے؟ اگر وہ نہیں تو پھر کیا علی خاں المعروف عبدالرؤف ہے جس غریب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کانگریس کیا بلا ہے اور لیگ کس جانور کا نام ہے اگر وہ نہیں تو پھر کیا بمبئی کے بدمعاشوں کا وہ سردار جو اسٹیج کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا اور جو اپنے سیاسی اختلافات کو اس ماہرانہ جملے میں ادا کرتا تھا کہ میرا ملک کابل کیوں ہندوؤں کو بخش رہے ہو: اگر وہ صرف مزدور تھے اور سیاست کا معلم اول وہی تھا۔ جس کے ذریعہ انھوں نے مزدوری پائی تو کیا سلیمان قاسم مٹھا کے روپوؤں کی تھیلیوں میں اس سیاسی مہم و تدبر کو ڈھونڈیں حالانکہ روپیہ سے آلو اور بمبئی کے بدمعاش دونوں چیزیں خریدی جاسکتی ہیں مگر نہ تو عقل خریدی جاسکتی ہے اور نہ علم"۔

طنز کی بہترین مثالیں ان کے مضامین "حدیث الغاشیہ" اور مولوی عبدالماجد سے حظ و کرب اور لذت و الم کی بحث میں بکثرت ملتی ہیں اور میں بخوفِ طوالت ان کو نظر انداز کرتا ہوں۔

اور پھر ان سب چیزوں کے علاوہ جا بجا اردو، عربی، فارسی اشعار کا استعمال اس برجستگی سے کرتے ہیں کہ خود شعر کی اہمیت پہلے سے بڑھ جاتی ہے اور اگر اسے غلو و اغراق سے تعبیر نہ کیا جائے تو مجھے یہ کہنے میں مطلق باک نہیں کہ کسی شاعر کا شعر استعمال کرکے اس پر احسان کرتے ہیں۔ وہ شعر نہیں کہتے لیکن شعریت کی روح کو سمجھتے ہیں۔ معلوم نہیں کتنے تیر و نشتر مولانا کے حافظہ میں محفوظ ہیں۔ کہ لکھتے وقت

ایک ایک دو دو سطروں کے بعد مختلف اشعار کو نگینوں کی طرح جوڑتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی مسائل کے متعلق جگہ جگہ قرآن و سنت سے استدلال کرتے جاتے ہیں۔ اور اس بے پناہ طرزِ استدلال کے موجد بھی وہ خود ہی ہیں۔ ان سے متاثر ہو کر بہتوں نے یہی اندازِ استدلال اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ زور ہمہ گیری اور برجستگی جو ان کے یہاں موجود ہے کسی سے نہ بن پڑی۔ اس کی ایک وجہ ان لوگوں کی علمی کم مائگی بھی ہے۔ دراصل ان کا طرزِ انشا ان کی ذات سے صفت نہیں اور وہ اپنے اس رنگ میں منفرد ہیں اور پھر اعادۂ مطالب کے واسطے جس قدر مختلف اندازِ بیان ان کے یہاں موجود ہیں اردو کے کسی انشا پرداز کے یہاں شاید ہی موجود ہوں۔ خیالات کی آمد کی یہ حالت ہوتی ہے کہ عنانِ قلم کا کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ترجمان القرآن کے مسودات کی دو تین دفعہ بربادی کے بعد آپ کی طبیعت افسردہ ہو گئی تھی۔ اور پھر رشتہ کار کی یہ گرہ مدتوں کے بعد کھلی تو لکھتے ہیں: "یا تو یہ حال تھا کہ بار بار کوشش کی مگر طبیعت کا انقباض دور نہ ہوا۔ یا اب خود بخود کھلی تو اس طرح کہ قلم روکنا بھی چاہتا ہوں تو نہیں رک سکتا ؎

شوریست نوازیزی تارِ نفسم را پیدا نہ اے جنبشِ مضراب کجائی

مولانا کی تحریروں میں بعض اوقات یہ نقص رہا ہے کہ خیالات کی بے پناہ آمد اور تبحرِ علمی کی بدولت بعض اوقات اصل موضوع سے ہٹ کر اس کے دور دراز گوشوں میں چلے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ باتیں بھی خارج از موضوع نہیں ہوتیں لیکن دور دراز کے گوشوں کی تشریح و اطناب سے اصل مدعا ع "تو خود حدیثِ مفصل بخواں ازیں مجمل" کہہ کر ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر ایک اوسط درجے کی قابلیت کے آدمی کے واسطے تسلسل قائم رکھنا بسا اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی بے لگام انشا پردازی کی بہترین مثال ان کا "تذکرہ" ہے جسے اپنے جد امجد سے شروع کرتے ہوئے امام ابنِ تیمیہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ تک لے اڑتے ہیں۔ اگرچہ موضوع کا تقاضا یہی تھا لیکن ایک عامی کے واسطے یہ بھول بھلیاں ایک عجیب و غریب

چیز بن جاتی ہے اور پھر اس کے ساتھ تذکرے کا انداز بیان قارئین کے ایک مخصوص طبقے ہی سے صحیح معنی میں خراجِ تحسین حاصل کر سکتا ہے مگر اب شکر ہے کہ یہ قصہ پارینہ ہو چکا ہے۔

ایک اور چیز جو مولانا کی تحریروں میں بعض جگہ ملتی تھی (اب نہیں) وہ یہ تھی کہ وہ الفاظ اور فقروں کی نشست و برخاست کچھ اس طرح کرتے تھے کہ سامع یا قاری کا ذہن و دماغ پرسش کی بجائے پرستش کی طرف مائل ہو جاتا تھا۔ اور اس میں ان کے داعیانہ انداز اور طرز نگارش کو بھی بہت حد تک دخل ہے۔ قاری ان کے الفاظ و فقرات کی دروبست سے مسحور ہو کر دلائل کے استحکام سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ ان کی عبارت میں ایک خاص قسم کی تقدیس والوہیت سی جھلکتی ہے۔

مولانا کی زندگی کی بہترین کاوشیں قرآنی آیات کا اردو میں ترجمہ ہے۔ ان کو آیات کا ترجمہ کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے، ان کے ترجمے میں عربی متن کی قریب قریب وہی اہمیت و عظمت باقی رہتی ہے۔ ادبی اعتبار سے اس سے بڑھکر اردو زبان میں کوئی ترجمہ نہیں ہوا۔ ترجمے میں وہی اسلوبِ بیان قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے جو خود قرآنِ حکیم کا اسلوبِ بیان ہے اور پھر سورتوں کے اواخر میں بصیرت افروز نوٹ دیئے ہیں جو مذہبی امور کے علاوہ، تاریخی، عمرانی اور سیاسی گتھیوں کو بڑی خوش اسلوبی سے سلجھاتے ہیں۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ مولانا ابوالکلام گر یورپ میں ہوتے تو نہ معلوم کتنی انجمنیں ان کے نام پر قائم ہوتیں اور کتنے مطابع ان کی تصانیف کی اشاعت کے لئے وقف ہوتے۔ مگر یہاں غلامی نے دوسرے جوہروں کی طرح قدر شناسی کا جوہر بھی کھو دیا۔ اردو ادب کے تذکرے اس مایۂ ناز ادیب کے ذکر سے خالی نظر آتے ہیں۔ اگر کسی نے ذکر کیا بھی تو ان کے کارناموں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ہے اور بس۔ افسوس ہے ہمارے نوجوان میکالے، بیکن، شیکسپیر اور گبن وغیرہم کی تصانیف پر نہایت فخر سے قلم اٹھاتے ہیں لیکن کسی کو یہ نصیب نہیں ہوتا کہ اپنے وطن کے اس قابلِ قدر ادیب کے کارناموں کی طرف توجہ دے۔ جس پر بقول شخصے سینکڑوں، اسپنسروں اور ہزاروں میکالے بے دریغ نچھاور کئے جا سکتے ہیں۔